عصری تہذیبی کشمکش میں
بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت اور تقاضے

——————— ڈاکٹر محمد اکرم وِرک

اربابِ دانش سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ گلوبلائزیشن (Globalization) کے اس دور میں بین المذاہب مکالمہ (Inter-Faith Dialogue) کی ضرورت و اہمیت پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ باہمی مکالمہ ہی وہ واحد آپشن ہے جس سے کسی بھی مذہب کا داعی مخاطب کو اپنی دعوت کی طرف متوجہ کرسکتا ہے۔ باہمی مکالمہ دعوت کا ایک ایسا اسلوب ہے جس کے ذریعے مخاطب کو زیادہ گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ گفتگو کا یہ ایسا اسلوب ہے جس میں متکلم اور سامع کے درمیان براہِ راست گفتگو ہوتی ہے اور حقائق پوری طرح نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ پھر یا تو مخاطب مدِّ مقابل کے موقف کو قبول کر لیتا ہے یا اسے دلائل کی بنیاد پر رد کر دیتا ہے۔ یہ مکالمہ افراد کے درمیان بھی ہوسکتا ہے اور مختلف تہذیبوں اور مذاہب کے درمیان بھی۔

بین المذاہب مکالمہ کی اہمیت

بہ حیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور آپؐ کی امت آخری امت ہے۔ اس لیے دنیا کے تمام انسانوں تک پیغامِ الٰہی پہنچانا ہماری بنیادی ذمہ داری ہے۔ قرآن و حدیث کے متعدد نصوص سے واضح طور پر امت محمدیہ ﷺ پر انفرادی اور اجتماعی سطح پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے۔ مختلف ممالک کے حکم رانوں کے نام رسول اللہ ﷺ کے دعوتی و تبلیغی خطوط جہاں معاصر مذاہب اور تہذیبوں سے آپؐ کے مکالمہ کی ایک خوب صورت مثال ہیں، وہیں یہ خطوط اس بات کی

بھی دلیل ہیں کہ اسلام اصلاً دینِ دعوت ہے اور اس کی دعوت کا دائرہ کار تمام عالم کو محیط ہے ،اس لیے اس کے عالمی پیغام کو دوسروں تک پہنچانا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔ مذاہبِ عالم میں اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے نہ صرف عالم گیر سطح پر دعوت و تبلیغ کا حکم دیا ہے، بلکہ دوسری تہذیبوں، قوموں اور افراد کے ساتھ گفتگو اور مکالمے کے با قاعدہ اصول بھی بیان کیے ہیں۔مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدْعُ إِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ. (النحل: ۱۲۵)	آپؐ لوگوں کو اپنے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے بلائیے اور ان کے ساتھ پسندیدہ طریقہ سے بحث کیجئے۔

اسلام کی یہ ایک ایسی انفرادیت ہے جو اسے تمام الہامی اور غیر الہامی مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔علامہ سید سلیمان ندویؒ (م ۱۹۵۳ھ) لکھتے ہیں:

''یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو سچائی قبول کرنے کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو الہامی اور تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے، لیکن صحیفہ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت اختصار، لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیرؤوں کو یہ بتایا کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔''[۱]

مذاہبِ عالم میں عملی طور پر صرف عیسائیت اور اسلام ہی تبلیغی مذاہب ہیں، دیگر تمام مذاہب کا دائرہ کار کسی خاص علاقے یا نسل تک محدود ہے، جبکہ عیسائیت کی عالم گیر دعوت اور اشاعت بھی حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کے منافی ہے، کیوں کہ ان کی بعثت خاص بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کا بیان ہے:

''میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا'' (انجیل متّی، ۱۵:۲۴)

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب بارہ نقیب مقرر فرمائے اور ان کو مختلف علاقوں کی طرف دعوت وتبلیغ کے لیے روانہ کیا تو بطور خاص ان کو تلقین فرمائی:

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔'' (انجیل متّی، ۶:۱۰)

الغرض یہ صرف اسلام ہی ہے جس نے اپنے پیروکاروں کو نہ صرف دینِ اسلام کی ترویج واشاعت کا حکم دیا ہے، بلکہ دیگر مذاہب اور تہذیبوں کے ساتھ مکالمے کے بنیادی اصولوں کی بھی تعلیم دی ہے۔ داعی اعظم ﷺ نے مختلف اقوام اور تہذیبوں کے ساتھ جو مکالمہ فرمایا، سیرتِ طیبہ سے اس کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ آپؐ نے ایک طرف عرب کی مشرکانہ تہذیب کے نمائندہ افراد، سردارانِ قریش اور ان کے وفود سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکالمہ کیا اور دوسری طرف ورقہ بن نوفل سے لے کر نجران کے عیسائی علماء سے آپؐ کا مکالمہ گویا عیسائیت سے انفرادی اور اجتماعی سطح پر مکالمہ تھا۔ اسی طرح مدنی دور کے اوائل میں میثاق مدینہ، جس کے بڑے فریق یہودی قبائل تھے، یہود سے مکالمہ ہی کی ایک صورت تھی۔

بین المذاہب مکالمے کا بنیادی اصول- ہم زبانی

آں حضرت ﷺ نے مختلف صحابۂ کرام کو دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا، کیوں کہ دعوت وتبلیغ اور باہمی مکالمہ میں تاثیر اور قوت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب پیغام کی زبان آسان، نرم اور قابل فہم ہو۔ ہم زبانی سے اُنسیت میں اضافہ ہوتا ہے، اجنبیت دور ہوجاتی ہے اور گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابتؓ (م ۴۴ھ) کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا تھا، تاکہ یہود سے انہی کی زبان میں گفتگو کی جاسکے اور انہی کی زبان میں ان کے خطوط کا جواب دیا جاسکے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے:

فتعلّمت کتابهم، مامرّت بی خمس عشرة لیلة حتی حذقته و کنت أقرأ لـه کتبهم اذا کتبوا الیه و أجیب عنه اذا کتب. ۲؎

پس میں نے ان کی زبان میں لکھنا سیکھ لیا۔ ابھی پندرہ دن نہیں گزرے تھے کہ میں اس میں ماہر ہوگیا۔ جب یہودی کوئی خط آپ ؐکو لکھتے تو میں آپ ؐکو پڑھ کر سنا دیتا اور اگر آپ ؐکو جواب لکھنا ہوتا تو وہ میں لکھ دیتا۔

اسی طرح ایک روایت میں ہے کہ ایک ایرانی عورت حضرت ابو ہریرہؓ (م ۵۸ھ) کی خدمت میں استغاثہ لے کر آئی کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب مجھ سے میرا بیٹا بھی چھیننا چاہتا ہے۔ اس عورت نے یہ ساری گفتگو فارسی زبان میں کی اور ابو ہریرہؓ نے بھی اس سے اسی زبان میں گفتگو کی، پھر آپ نے بچہ عورت کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ ۳؎

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہٗ کرام نے دوسری قوموں کی زبانیں صرف اس غرض سے سیکھ رکھی تھیں، تا کہ ان سے براہ راست تبادلۂ خیال کرکے ان کے مسائل کو حل کیا جا سکے۔ بعض روایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ صحابہٗ کرام نے قرآن مجید کے بعض اجزا کا دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی کیا تھا، تا کہ عربی زبان سے ناواقف لوگ اسلام کی حقیقی روح اور تعلیمات سے محروم نہ رہ جائیں۔ چنانچہ علامہ سرخسیؒ (م ۴۹۰ھ) لکھتے ہیں:

ان الفرس کتبوا الی سلمانؓ ان یکتب لهم الفاتحة بالفارسیة، فکانوا یقرء ون ذلک فی الصلوة حتیٰ لانت ألسنتهم للعربیة. ۴؎

بعض نو مسلم ایرانیوں نے حضرت سلمانؓ کی خدمت میں لکھا کہ ان کے لیے سورۃ الفاتحہ کو فارسی میں نقل کر دیا جائے، چنانچہ وہ لوگ (اسی ترجمہ کو) نماز میں پڑھتے تھے، یہاں تک کہ وہ عربی سیکھ گئے۔

اس واقعے کو ڈاکٹر حمید اللہؒ نے 'النہایۃ حاشیۃ الھدایۃ' کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ (م ۳۳ھ) نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے یہ کام انجام دیا اور ان کے ترجمے کا ایک جز بھی نقل کیا ہے، "بنام خداوند بخشایندہ مہربان"۔ یہ بسم اللہ کا ترجمہ ہے۔ ۵؎

اس کے علاوہ جن صحابۂ کرام کو رسول اللہ ﷺ نے مختلف قوموں کی طرف داعی اور مبلغ بنا کر روانہ فرمایا ان کے معاملے میں بھی یہ چیز آپ ؐ کی حکمتِ عملی کا حصہ نظر آتی ہے کہ وہ مبلغ اسی قوم سے تعلق رکھتے ہوں، بہ صورتِ دیگر وہ اس قوم کی زبان، رسم ورواج اور کلچر سے آگاہ ہوں۔

اسلام کی ترجیح - امن اور مکالمہ

سیرتِ طیبہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کو جنگ اور امن میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا موقع ملا تو آپ ؐ نے ہمیشہ امن کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ ۶ھ کے موقع پر آپ ؐ نے ایسی شرائط پر بھی صلح قبول کر لی جن سے بہ ظاہر مسلمانوں کی پسپائی کا تاثر ملتا تھا۔ اگرچہ ان شرائط کو قبول کرنے سے مسلمانوں کی دل شکنی ہوئی اور بعض صحابہ کو اس پر بڑا اضطراب بھی ہوا، لیکن آپ ؐ نے جنگ پر امن کو ترجیح دی، کیوں کہ آپ ؐ اپنے نورِ بصیرت سے دیکھ رہے تھے کہ امن کی صورت میں جب مسلمانوں اور مشرکوں کو آزادانہ ماحول میں میل جول کے مواقع حاصل ہوں گے تو قریش اور دیگر قبائل مسلمانوں کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب مسلمان اور قریش ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر ملنے لگے اور انہیں ایک دوسرے کے موقف کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا تو صرف دو سال کے عرصہ میں یعنی فتح مکہ ۸ھ تک اتنی بڑی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے جتنے پہلے تمام عرصے میں نہیں ہوئے تھے۔ امام زہریؒ (م ۱۲۵ھ) کا بیان ہے:

فما فتح فی الاسلام فتح قبله کان أعظم منه، انما کان القتال حیث التقی الناس، فلما کانت الهدنة، ووضعت الحرب وآمن الناس بعضهم بعضاً، التقوا فتفاوضوا فی الحدیث

صلح حدیبیہ سے پہلے اسلام میں اتنی بڑی فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لوگ جہاں بھی ملتے جنگ ہو کر رہتی تھی، لیکن جب صلح ہوگئی اور جنگ موقوف ہوگئی اور لوگ ایک دوسرے سے بے خوف ہوگئے، باہم ملے جلے، باتیں ہوئیں تو کوئی عقل مند ایسا نہیں تھا جس سے

المنازعة، فلم یکلم احد بالاسلام یعقل شیئا الادخل فیه، ولقد دخل فی تینک السنتین مثل من کان فی الاسلام قبل ذلک او اکثر. ۶

اسلام کے متعلق گفتگو ہوئی اور اس نے اسے قبول نہ کیا ہو۔ چنانچہ جتنے لوگ ابتداء سے اب تک مسلمان ہوئے تھے صرف ان دو برسوں میں ان کے برابر بلکہ ان سے زیادہ تعداد میں لوگ مسلمان ہو گئے۔

اسلام میں دعوت اصل ہے اور جہاد ضرورتاً فرض کیا گیا ہے۔ وہ صرف اسلامی تہذیب وتمدن کے دفاع اور استحکام کے لیے ہے، اس لیے لامحالہ اسلام کی ترویج واشاعت کا تمام تر انحصار صرف دعوت وتبلیغ اور باہمی مکالمہ پر ہے، اس لئے ایک سچے داعی کی حیثیت سے ہمارے لئے بین المذاہب مکالمہ کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کرنا دینِ اسلام کا بنیادی تقاضا بن جاتا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ باہمی مکالمہ اور امن وامان کا ماحول اسلام کی ضرورت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جب بھی دلائل کی بنیاد پر گفتگو ہوگی تو میدان ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کے ہاتھ ہی رہے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ الَّذِیٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُون. (التوبۃ:۳۳)

(وہ اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کردے خواہ مشرکوں کو کیسا ہی ناگوار ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں اکثر مفسرین نے یہی لکھا ہے کہ اسلام کا غلبہ تمام ادیان پر عقل واستدلال کی رُو سے تو مطلق ہے اور وہ کسی زمانہ اور وقت کے ساتھ مخصوص نہیں، البتہ مادی غلبہ اہلِ اسلام کی اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ مشروط ہے، کیونکہ آزادانہ مباحثے اور مکالمے میں آخرکار جو چیز باقی رہے گی وہ سچائی ہے، جب کہ کامل اور بے داغ سچائی اسلام کے علاوہ کسی اور کے پاس نہیں ہے۔ اسلام کے پاس طاغوت کو شکست دینے کے لیے دلائل وبراہین کی ہرگز کمی نہیں ہے اور مکالمے کی میز پر یہی ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب دلیل ہار جائے تو انسان اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتا ہے۔ توہین آمیز خاکوں سمیت اہل مغرب کی اسلام کے خلاف موجودہ آویزش دراصل دلیل کی شکست کا اعتراف ہی تو ہے۔ اس وقت جب کہ مغرب دلیل کی زبان میں اسلام کا مقابلہ کرنے سے پہلو تہی کر رہا ہے اور اپنی برتر ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مسلمانوں کا مقابلہ جنگ کے میدان میں کرنا چاہتا ہے، مسلمان اہل دانش کا کام یہ ہے کہ وہ اہلِ مغرب کو مکالمے کی اس میز پر کھینچ لائیں جہاں انہیں مدِّ مقابل پر فیصلہ کن برتری حاصل ہے، کیونکہ یہی وہ میدان ہے جس میں اسلام کی کامیابی کے امکانات سو فیصد ہیں، بشرطے کہ ہم اسلام کو صحیح طور پر اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس موقف کی ایک دلیل وہ مکالمہ بھی ہے جو نجران کے عیسائی علماء اور حضور ﷺ کے درمیان ہوا۔ جب عیسائی علماء آپؐ کے دلائل کے سامنے بالکل عاجز آ گئے تو انھوں نے جزیہ دینے کی شرط پر آپؐ سے صلح کر لی۔ عیسائی علماء کا دلیل اور استدلال کو چھوڑ کر جزیہ پر صلح کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس حقیقت کو جان چکے تھے کہ اسلام کا مقابلہ مکالمے اور استدلال کی زبان میں ممکن نہیں۔ اہل علم واقف ہیں کہ ولیم میور (م ۱۹۰۵ء) نے اپنی کتاب The Life of Muhammad میں رسول اللہ ﷺ کے مقام اور مرتبہ کو کم کرنے کی کوشش کی تو علامہ شبلی نعمانیؒ (م ۱۹۱۴ء) نے اپنے قلم کو جنبش دی، اپنے شعور کو مجتمع کیا اور اپنے فہم و ادراک کو کام میں لاتے ہوئے 'سیرت النبی ﷺ' جیسی معرکہ آرا کتاب سے مستشرق موصوف کا منہ بند کر دیا۔ دورِ حاضر میں 'ضیاء النبی ﷺ' کی صورت میں پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ (م ۱۹۹۸ء) نے بھی یہی خدمت انجام دی ہے۔

عصر حاضر میں اسلام کا مکالمہ، لیکن کس مذہب سے؟

اس وقت مختلف سطحوں پر بین المذاہب مکالمے کی ضروت و اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ جون ۲۰۰۴ء میں اوسلو (ناروے) میں پہلی بین المذاہب کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ناروے کی حکومت اور وہاں کے چرچ کی دعوت پر مولانا محمد حنیف

جالندھری، مفتی منیب الرحمٰن، ریاض حسین نجفی اور بشپ سموئیل عزرایاہ وغیرہ نے شرکت کی۔ عالمی سطح کی اس بین المذاہب کانفرنس میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے بین المذاہب ہم آہنگی اور محبت کی فضا کو فروغ دینے پر زور دیا۔ 'اعلانِ اوسلو' کے تحت پاکستان میں بھی 'ورلڈ کونسل آف ریلیجنز برائے عالمی امن وعدلِ اجتماعی' کے زیر اہتمام ۱۶ر ستمبر ۲۰۰۴ء کو نیشنل لائبریری ہال، اسلام آباد، میں پہلی بین المذاہب کانفرنس کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ مسلسل جاری وساری ہے۔ یقیناً یہ ساری کوششیں لائقِ صد تحسین اور قابلِ قدر ہیں، لیکن اس ساری تگ ودو کے مثبت اور دوررس نتائج اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب ہم بعض باتیں طے کرلیں۔ سب سے پہلی بات تو ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ آج کی عالمی صورتِ حال میں اس مکالمے کے اصل فریق کون ہیں؟ اور دوسری یہ کہ اس مکالمے کا ایجنڈا کیا ہے؟ اس طرح ہمارے لئے یہ ممکن ہوگا کہ ہم علمی حلقوں میں اپنا موقف بہتر طور پر پیش کرسکیں۔

فی الوقت دنیا میں اسلام کے علاوہ عیسائیت، یہودیت، ہندومت، بدھ مت، جین مت وغیرہ ہی کو دنیا کے بڑے اور زندہ مذاہب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ وحی، الہام اور خدا پر یقین رکھنے والے زیادہ تر لوگوں کا تعلق انہی مذاہب سے ہے۔ اپنی غیر فطری اور غیر عقلی تعلیمات کی وجہ سے ان مذاہب کا ماضی میں بھی انسانی سوسائٹی کے اجتماعی معاملات سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا ہے، لیکن عقل پرستی (Rationalism) کے موجودہ دور میں مذہب کا لوگوں کی ذاتی زندگی سے عمل دخل بھی بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہو رہا ہے اور اس وقت عملی طور پر مسلمانوں کے علاوہ انسانوں کی غالب اکثریت لادین اور سیکولر ہے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ اسلام کے بعد اس وقت بلا امتیاز رنگ ونسل پوری دنیا میں مغربی سیکولرزم مقبول ترین مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اس وقت جب کہ دنیا کے تمام مذاہب ایک تاریخی یادگار کی حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں، یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں مغربی فکر وفلسفہ کی بنیاد پر پروان چڑھنے والا سیکولرزم ہی اسلام کا اصل مدِّ مقابل ہے۔

حالات کے سرسری جائزے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت مغرب اور مسلمانوں کے درمیان جو علمی، فکری اور تہذیبی کشمکش جاری ہے اس کے اصل فریق مغرب کے مذہب سے منحرف سیکولر حلقے اور مذہب پر پختہ یقین رکھنے والے مسلمان ہیں، جب کہ عیسائی علما اس مکالمے کے اصل فریق نہیں ہیں، کیوں کہ مغرب کے عیسائی رہ نما جس مذہب کی نمائندگی کرتے ہیں اس کا مغرب کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے موجودہ کشمکش میں عیسائی علماء سے مکالمہ کی افادیت محدود ہے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود ہمیں عیسائیت اور دیگر مذاہب سے گفتگو اور مکالمے سے انکار نہیں ہے، تاہم روایتی عیسائی حلقے سے ہماری گفتگو اس موضوع پر ہونی چاہیے کہ عیسائی مذہبی رہ نما اپنے معاشرے کو وحی الٰہی اور آسمانی تعلیمات کی طرف واپس لانے کے لیے کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ جب کہ وہ اصولی طور یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ مذہب ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس وقت، جب کہ پوری دنیا میں صرف مسلمان ہی بنی نوع انسان کو وحی الٰہی اور مذہب کی طرف واپس لانے کی کوشش کر رہے ہیں، سوال یہ ہے کہ مغرب کے مذہبی حلقے اس سلسلے میں مسلمانوں کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟ مسلمانوں کو اپنے عیسائی مخاطبین پر یہ حقیقت واضح کرنی چاہیے کہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، جو الحاد اور لادینیت کے خوف ناک طوفان کے اندر گھری ہوئی ہے۔ اس عالم گیر طوفان کے خلاف مسلمان، مسیحی اور دیگر مذہبی علماء ایک دوسرے کے فطری اتحادی ہیں۔ عیسائی علماء کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ واقعی وحی اور آسمانی تعلیمات کی صداقت پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور انسانی معاشرے پر اس کی علم برداری کے خواہش مند ہیں تو انہیں سیکولر حلقے کی تائید کے بجائے وحی اور آسمانی تعلیمات کے معاشرتی کردار کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

روایتی مذہبی حلقے سے مکالمے کے بنیادی اصول

بہ حیثیت مسلمان ہم پر لازم ہے کہ نسلِ انسانی کی فلاح اور بہتری کے لئے ہم مسیحیت کے ساتھ مکالمہ میں مشترک صفات پہ زور دیں۔ دینِ ابراہیمی کی مشترک

روایت، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کا احترام اور ہمارے مشترک سماجی بندھن وغیرہ عیسائیت کے ساتھ مکالمے کی بنیاد بن سکتے ہیں ۔ اس سلسلے میں مختلف حکم رانوں کے نام آپ ؐ کے خطوط ہمارے لئے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ہرقل اور دیگر عیسائی حکم رانوں کو رسول اللہ ﷺ نے بذریعہ خطوط اسلام کی جو دعوت دی تھی، اس میں یہ آیت درج تھی: **قُلْ يَآاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا** (آل عمران:۶۴) (آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب ایسے قول کی طرف آجاو جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں) اس آیت کا مکرر استعمال ہمارے لیے قابلِ توجہ ہے۔ اسی طرح مکاتیب نبوی لے جانے والے سفراء نے جس طرح اپنے مخاطبین سے مکالمہ کیا، وہ اسلوب بھی ہمارے لئے بین المذاہب مکالمے کی بنیاد بن سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ (م ۳۰ھ) کو شاہِ مصر مقوقس کی طرف دعوتی خط دے کر روانہ فرمایا۔ ابنِ اثیر (م ۶۳۰ھ) نے حضرت حاطبؓ اور شاہِ مصر کے درمیان ہونے والے مکالمے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جب شاہِ مصر نے حضرت حاطبؓ سے یہ کہا کہ اگر تمہارے صاحب اللہ کے رسول ہیں تو پھر انھوں نے اس وقت اپنی قوم کے خلاف بددعا کیوں نہ کی جب اس نے ان کو ان کے اپنے شہر سے نکالا ؟ تو حضرت حاطبؓ نے فرمایا: عیسیٰؑ بن مریم کی نسبت آپ خود کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول تھے، پھر جب ان کو ان کی قوم نے سولی دینے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ان کو بددعا کیوں نہ دی ؟ یہاں تک کہ اللہ نے ان کو آسمان پر اٹھالیا۔ مقوقس اس برجستہ جواب سے بڑا متاثر ہوا اور کہنے لگا:

احسنت! انت حکیم جاء من عند حکیم . ۷	تم نے اچھا جواب دیا، تم حکیم ہو اور حکیم کے پاس سے آئے ہو۔

امام ابنِ قیمؒ (م ۷۵۱ھ) نے مقوقس اور حضرت حاطبؓ کے باہمی مکالمے کی جو روایت نقل کی ہے وہ حسب ذیل ہے:

حاطبؓ: ''(اس زمین پر) تم سے پہلے ایک شخص (فرعون) گزرا ہے جو اپنے آپ کو ربِ اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اللہ نے اسے آخر واوّل کے لیے عبرت بنا دیا۔ پہلے تو اس کے ذریعے لوگوں سے انتقام لیا، پھر خود اس کو انتقام کا نشانہ بنایا، لہٰذا دوسروں سے عبرت پکڑو، ایسا نہ ہو کہ دوسرے تم سے عبرت پکڑیں۔''

مقوقس: ''ہمارا ایک دین ہے جسے ہم چھوڑ نہیں سکتے، جب تک کہ اس سے بہتر دین نہ مل جائے۔''

حاطبؓ: ہم تمھیں اسلام کی دعوت دیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے تمام ماسوا (ادیان) کے بدلے کافی بنا دیا ہے۔ دیکھو! اس نبی ﷺ نے لوگوں کو (اسلام کی) دعوت دی تو اس کے خلاف قریش سب سے زیادہ سخت ثابت ہوئے، یہود نے سب سے بڑھ کر دشمنی کی اور نصاریٰ سب سے زیادہ قریب رہے۔ میری جان کی قسم! جس طرح موسیٰؑ نے عیسیٰؑ کے لیے بشارت دی تھی، اسی طرح حضرت عیسیٰؑ نے حضرت محمد ﷺ کے لیے بشارت دی ہے اور ہم تمھیں قرآن مجید کی دعوت اسی طرح دیتے ہیں جیسے تم اہل تورات کو انجیل کی دعوت دیتے ہو۔ جو نبی جس قوم کو پاجاتا ہے وہ قوم اس کی امت ہو جاتی ہے اور اس پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس نبی کی اطاعت کرے اور تم نے اس نبی کا عہد پالیا ہے، اور پھر ہم تمھیں دینِ مسیح سے روکتے نہیں ہیں، بلکہ ہم تو اسی کا حکم دیتے ہیں۔''

مقوقس: میں نے اس نبی ﷺ کے معاملہ پر غور کیا تو میں نے پایا کہ وہ کسی ناپسندیدہ بات کا حکم نہیں دیتے اور کسی پسندیدہ بات سے منع نہیں کرتے۔ وہ نہ گمراہ جادوگر ہیں نہ جھوٹے کاہن، بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ ان کے ساتھ نبوت کی یہ نشانی ہے کہ وہ پوشیدہ کو نکالتے ہیں اور سرگوشی کی خبر دیتے ہیں۔ میں مزید غور کروں گا۔''[۸]

حضرت حاطبؓ اور مقوقس کے اس مکالمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن اصحابؓ کو دوسری قوموں کی طرف دعوت وتبلیغ کے لیے روانہ فرمایا، ان کی تربیت کئی پہلوؤں سے کی۔ ایک پہلو یہ کہ جو صحابیؓ جس قوم کی طرف جائے اس کی زبان سے اچھی طرح واقف ہو، دوسرا یہ کہ اسے ان کے کلچر اور رسم ورواج سے بھی

واقفیت ہو، تیسرا یہ کہ وہ ان کے دین سے، جس کو وہ اختیار کیے ہوئے ہوں، آگاہ ہو اور چوتھا یہ کہ وہ اس سرزمین کے پورے جغرافیہ سے بھی مکمل واقفیت رکھتا ہو، تاکہ باہمی مکالمہ میں اسے ان معلومات کی بنا پر اپنے مخاطب پر علمی برتری حاصل رہے۔ یہاں اختصار کے پیشِ نظر محض ایک مثال پیش کی گئی ہے، اگر تمام نبوی سفراء کے احوال کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو بین المذاہب مکالمے کے لئے کئی راہ نما اصول اخذ کیے جاسکتے ہیں۔[۹]

اہلِ مغرب کے تحفظات پر مکالمے کا اسلوب

جو لوگ خدا، رسول اور آخرت پر اعتقاد رکھتے ہوں ان کے ساتھ مکالمہ نسبتاً آسان ہے، اگرچہ اہل مغرب کا اب بھی چرچ کے ساتھ کم زور سا تعلق باقی ہے، لیکن ان کی اکثریت بالخصوص اہلِ یورپ عیسائیت کی بنیادی تعلیمات سے دست بردار ہو چکے ہیں، اس لئے مسلمان مبلغین کو مغرب میں تمام خرابیوں کی ذمہ داری عیسائیت کے سر نہیں ڈال دینی چاہیے، بلکہ ان کے ساتھ مکالمے میں ان کے موجودہ نظریات ہی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا گیا کہ موجودہ علمی اور فکری کشمکش میں اسلام کے ساتھ مکالمے کا اصل فریق اور مدِّ مقابل مغرب کا موجودہ دانش ور اور سیکولر طبقہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمارا مکالمہ اسی وقت مفید ہوسکتا ہے جب ہم مغربی فکر وفلسفہ کے تاریخی ارتقاء، پسِ منظر اور اس کے اصل فکری سرچشموں سے آگاہی رکھتے ہوں اور ہم میں مغربی افکار کا تنقیدی جائزہ لینے کی صلاحیت ہو۔ اس حوالے سے جن پہلوؤں پر خصوصی غور وفکر کی ضرورت ہے وہ درج ذیل ہیں:

ایک تو اس پہلو کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مغرب مسیحیت کو چھوڑ کر موجودہ سیکولرزم تک کیوں اور کیسے پہنچا؟ ہمارے لئے اس تاریخی حقیقت کا ادراک ضروری ہے کہ سولہویں صدی عیسوی تک مغرب میں قدیم عیسائیت ہی غالب تھی، طاقت اور اختیار پوپ کے ہاتھ میں تھا۔ مارٹن لوتھر (Martin Luther) (م ۱۵۴۶ء) پہلا شخص تھا جس نے پوپ کے اختیار کو چیلنج کیا اور ساتھ ہی عقلِ انسانی کو وحی کی تعبیر کا واحد ذریعہ قرار دیا۔

یہی وہ دور ہے جس کے بعد مغربی معاشرے پر عیسائیت کی گرفت آہستہ آہستہ کم زور پڑنے لگی، لیکن جس فکر نے بالآخر عیسائیت کو مکمل پسپائی اور شکست پر مجبور کیا وہ اٹھارویں صدی عیسوی میں پروان چڑھنے والی تحریکِ تنویر (Enlightenment Movement) اور تحریکِ رومانیت (Romanticism) ہے۔ مغرب کی موجودہ روشن خیالی کی تحریک کا یہ وہ مختصر پس منظر ہے جس کا پوری تفصیل کے ساتھ تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا پہلو جس کا جائزہ لینا ضروری ہے وہ تحریکِ استشراق (Orientalism) ہے۔ اہلِ مغرب میں اسلام کے بارے میں پائی جانے والی ان بے شمار غلط فہمیوں کو ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک تحریکِ استشراق کے مقاصد، محرکات اور عالمِ مغرب پر اس کے اثرات کا بھرپور تجزیہ نہ کرلیں۔ بدقسمتی سے مستشرقین کی مرتب کردہ تاریخ نہ صرف زندہ ہے، بلکہ ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت بھی پوری دنیا میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعہ اسلام کی جو تصویر کشی کی جارہی ہے اس کا بڑا ماخذ مستشرقین کی وہی تحقیقات ہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

مغرب کے ساتھ باہمی مکالمہ کی صورت میں تیسری بات جس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں قرآن و حدیث سے رہ نمائی تو ضرور لینی چاہیے، تاہم مغرب کی نفسیات کے مطابق ہمیں سب سے پہلے اسلامی تعلیمات کے عقلی جواز پر بات کرنی ہوگی اور مغرب کے موجودہ سماجی علوم اور اسلام کے تقابلی مطالعہ کے بعد اسلامی احکام کی افادیت پر دلائل پیش کرنے ہوں گے اور اسلامی تعلیمات کی سماجی اور معاشرتی اہمیت واضح کرنی ہوگی۔ اسلامی احکام کے اسرار وحِکَم پر حضرت شاہ ولی اللہؒ (م ۱۱۷۶ھ) کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' بڑی ہی قابل قدر ہے۔ موجودہ حالات کے پس منظر ہی اس موضوع کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مغربی اقدار اور اہلِ مغرب کے تحفظات

مغرب اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تحفظات رکھتا ہے وہ دو قسم کے

ہیں۔ پہلی قسم کے تحفظات تو وہ ہیں جن کا تعلق اسلامی تاریخ اور نظامِ معاشرت سے ہے۔ اسلامی تعلیمات کا یہ وہ حصہ ہے جس کا براہِ راست ٹکراو مغرب کے موجودہ طرزِ معاشرت سے ہے۔ دوسری قسم کے تحفظات وہ ہیں جن کا تعلق دین کی اساس اور بنیاد سے ہے۔ مغرب کے ساتھ ہمارا مکالمہ اس وقت تک مفید نہیں ہوسکتا جب تک ہم کھلے ذہن اور مکمل تیاری کے ساتھ ان کے تمام تحفظات پر بات کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ سب سے پہلے ہمیں مغرب سے اس موضوع پر مکالمہ کرنا ہوگا کہ وہ دینِ اسلام پر ایک نظامِ حیات اور طرزِ معاشرت کی حیثیت سے غور کرے۔

انسانی حقوق اور اسلام

اس وقت مغرب میں مساوات، آزادی اور بنیادی انسانی حقوق کے سلسلے میں بڑی حساسیت پائی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے اسلام کے بارے میں یہ غلط تاثر پھیلا دیا گیا ہے کہ اسلام میں بنیادی انسانی حقوق اور خاص طور پر عورتوں کے حقوق کو بری طرح پامال کیا گیا ہے۔ ہمیں اہلِ مغرب پر واضح کرنا ہوگا کہ اسلام تمام انسانی حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور اس کے عطا کردہ حقوق ہی فطری بنیادوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً جب اسلام ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف قرار دیتا ہے تو کیا یہ حرمتِ انسان کا بہترین قانون قرار نہیں پائے گا؟ اسی طرح اسلام کی بیان کردہ تمام سزائیں بھی 'انسانی حق' کے اثبات ہی کے لیے ہیں۔ عورتوں کے حقوق میں بھی ان کے فطری دائرہ کار اور نفسیات کو مدِنظر رکھا گیا ہے۔

ایک داعی کی حیثیت سے جو بات ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے وہ یہ کہ اگرچہ انسانی حقوق کے عالمی منشور، (Universal Declaration of Human Rights) جو بجا طور پر آج کا عالمی قانون ہے، کی تمام شقوں کو قبول کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے، تاہم ہمیں اس بحث میں زیادہ مثبت اور تعمیری انداز میں حصہ لینا چاہیے اور اگر باہمی مکالمہ میں کسی جگہ لچک کی گنجائش موجود ہو تو اس کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ اس حوالے سے سیرت طیبہ ﷺ سے کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ

بعض مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے بین الاقوامی قانون، عرف اور قبائلی رسم ورواج کا احترام کیا۔ مثلاً جب آپؐ کا مسیلمہ کذّاب کے سفیروں سے مکالمہ ہوا تو آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو میں تمہیں قتل کروا دیتا۔[۱۰] دیکھئے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، لیکن آپؐ نے ان پر یہ حد جاری نہیں کی، بلکہ فرمایا کہ چوں کہ عالمی قانون یہ ہے کہ سفیروں کو قتل نہیں کیا جاتا، اس لیے میں تمہیں چھوڑ رہا ہوں، ورنہ میں تمہیں قتل کروا دیتا۔

سن ۹ ہجری میں اقرع بن حابسؓ کی زیر قیادت بنوتمیم کا وفد اسلام قبول کرنے کے لیے بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا، لیکن ان لوگوں نے قبولِ اسلام کے لیے بڑی عجیب شرط لگائی کہ آپؐ پہلے ہمارے ساتھ مفاخرت کریں، آپؐ کا خطیب ہمارے خطیب کا اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر کا مقابلہ کرے، تب ہم اسلام قبول کریں گے۔ آپؐ نے ان کے اس مطالبہ کو قبول کیا۔ چنانچہ آپؐ کے حکم پر حضرت حسان بن ثابتؓ نے ان کے شاعر زبرقان بن بدر کا مقابلہ کیا اور حضرت ثابت بن قیسؓ نے ان کے خطیب عطارد بن حاجب کا مقابلہ کیا۔ بنوتمیم نے بالآخر حضور ﷺ کے شاعر اور خطیب کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے اسلام قبول کرلیا۔[۱۱]

دیکھا جائے تو وفدِ بنی تمیم کا مطالبہ بالکل لایعنی تھا۔ بالفرض اگر مسلمانوں کا شاعر اور خطیب مقابلے میں شکست کھا بھی جاتے تو بھی اسلام کی حقانیت پر کوئی اثر نہ پڑتا، لیکن اس کے باوجود آپؐ نے ان کے رسم ورواج کا احترام کیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوسری قوموں کے ساتھ مکالمے کی اتنی زبردست تیاری کر رکھی تھی کہ بنوتمیم نے جب قبولِ اسلام کی یہ عجیب وغریب شرط رکھی تو آپؐ نے بلا جھجک ان میدانوں میں ماہر اپنے اصحاب کو طلب کیا۔ اسی طرح جب آپؐ نے مختلف حکم رانوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کرنے چاہیے تو بعض صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! حکم رانوں میں یہ اصول ہے کہ وہ ان خطوط پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتے

جن پر کوئی مہر (Seal) وغیرہ نہ ہو، چناں چہ اسی وقت آپؐ نے خطوط کو مُہر بند کرنے کے لیے مُہر بنانے کا حکم دیا۔۱۲

رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی کے کردار سے کون واقف نہیں؟ اس کی شر انگیزیوں کی وجہ سے اسلام کو کئی دفعہ نقصان اٹھانا پڑا۔صحابہ کرامؓ نے بارہا اس کے قتل کا ارادہ کیا، حتی کہ ایک دفعہ خود اس کے صاحب زادے، جو مخلص مومن تھے، نے بھی آپؐ سے اپنے باپ کے قتل کی اجازت طلب کی، لیکن آپؐ نے صحابہ کرامؓ کو ایسے کسی بھی عمل سے سختی کے ساتھ منع کر دیا اور فرمایا کہ میں اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ لوگ یہ کہیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کے قتل کا حکم دیتے ہیں۔اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو عبداللہ بن ابی سخت ترین سزا کا مستحق تھا لیکن آپؐ نے پھر بھی اس سے درگزر فرمایا، صرف اس وجہ سے کہ کہیں عام لوگوں کے ذہن میں اسلام کے بارے میں کوئی منفی تاثر پیدا نہ ہو جائے، گویا آپؐ کی نظر اصولی حکم کے نفاذ کے علاوہ اس کے نتائج اور عملی اثرات پر بھی تھی۔

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ ایک داعی کے لیے نہ صرف عالمی قانون، رسم ورواج اور عرف سے واقفیت ضروری ہے، بلکہ اگر دعوت اور مکالمہ کے مثبت نتائج کی توقع ہو تو دیگر اقوام کے قوانین اور رسم ورواج کا ممکن حد تک لحاظ اور احترام بھی کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اگر کسی اسلامی حکم کا نفاذ وقتی مصلحت کے خلاف ہو تو اس کے نفاذ میں توقف کیا جاسکتا ہے۔عصرِ حاضر میں مسلمان قانون دانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بین الاقوامی قانون کا سیرتِ طیبہ ﷺ کی روشنی میں مطالعہ کریں اور ان پہلوؤں کا جائزہ لیں جہاں باہمی گفتگو اور مکالمہ میں لچک کے پہلو کو مدنظر رکھا جاسکتا ہے۔

اسلام کا تصورِ جہاد

اسلام کے بارے میں اہلِ مغرب کو جو غلط فہمیاں ہیں ان میں سے ایک اس کا تصورِ جہاد ہے۔مدنی دور میں رسول اللہ ﷺ نے چھوٹی بڑی تقریباً ستاسی (۸۷) مہمات ترتیب دیں۔ان تمام مہمات کے مقاصد، محرکات اور اہداف مختلف تھے۔ان میں سے بعض انسدادی نوعیت کی تھیں تو بعض دفاعی تھیں، جب کہ بعض خالص دعوتی اور تبلیغی

نوعیت کی تھیں، لیکن محدثین اور مسلمان سیرت نگاروں نے ان تمام مہمات کو، جن میں ترتیب اور تنظیم کا معمولی سا بھی خیال رکھا گیا تھا، کتاب المغازی اور غزوات وسرایا کے عنوان سے ذکر کر دیا، جس سے اس غلط پروپیگنڈا نے جڑ پکڑی کہ اسلام جنگ وجدال کا دین ہے۔ مغرب میں یہ تاثر عام ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے اور اگر اب بھی مسلمانوں کو موقع ملا تو وہ بہ زورِ شمشیر اسلام کو تمام دنیا پر غالب کر کے دم لیں گے۔

اسلام کے تصورِ جہاد کے حوالے سے اہلِ مغرب کے ساتھ ہمارا مکالمہ دو پہلوؤں سے ہونا چاہیے، پہلی بات تو ہمیں یہ واضح کرنا ہوگی کہ ابتدائی ایک دو صدیوں میں اسلام کے اسپین، وسطی ایشیا اور برصغیر تک پھیلنے کی بڑی وجہ اسلامی تعلیمات کی معقولیت اور مسلمان مبلغین کی انتھک کوششیں ہیں۔ دنیا کے کتنے ہی علاقے ایسے ہیں جہاں اسلامی فوجوں کا کبھی داخلہ نہیں ہوا، لیکن اسلام وہاں بھی موجود ہے۔ انڈونیشیا اور ملیشیا پر بھلا کون سی اسلامی فوجیں حملہ آور ہوئی تھیں؟ لیکن کیا وہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں؟ اس لیے تاریخ کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اسلامی تاریخ کے کسی بھی دور میں اسلام کو دوسری اقوام پر ٹھونسنے کے لیے تلوار سے مدد لی گئی ہے۔

اس موضوع پر پروفیسر ٹی- ڈبلیو- آرنلڈ کی کتاب The Preaching of Islam ہمارے لیے بنیادی حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بدقسمتی سے جہاد کے بارے میں ہم اسلامی نقطۂ نظر کو اہلِ مغرب پر پوری طرح واضح نہیں کر سکے۔ عام لوگ اب بھی اسی پرانی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ہمیں اہلِ مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ اسلام کے پھیلنے کے اسباب دیگر ہی ہیں۔ مثلاً ہمیں دلائل کے ساتھ بتانا ہوگا کہ بہت سے عیسائی، جن سے ابتدائی دور میں اسلام کا مکالمہ ہوا وہ بھی مسلمانوں کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے قائل نہیں تھے۔ اس لئے عقائد کی یکسانیت ابتدائی دور کے مسیحیوں کے قبولِ اسلام کا بڑا سبب بنی ہے، ڈاکٹر حمید اللہؒ (م ۲۰۰۲ء) لکھتے ہیں:

> ''نجاشی فرقہ طبیعتِ واحد کا (یعنی مانوفرائٹ) عیسائی تھا۔ اور ان دنوں اس فرقے اور یونان کے عیسائیوں میں بڑے سخت اختلافات تھے، آخر

الذکر اس بات کے قائل تھے کہ حضرت عیسیٰ میں بہ وقت واحد دو طبیعتیں تھیں، انسانی اور خدائی بھی ۔ ابرہہ جو (یمن میں) نجاشی کا نائب تھا، حضرت عیسیٰ کو ابن اللہ نہیں بلکہ صرف مسیح اللہ مانتا تھا۔ غالباً نجاشی کے بھی یہی عقائد ہوں گے اور یہ مسلمانوں کے عقائد کے بہت مماثل ہیں''۔

اسی طرح روم اور ایران کے لوگوں نے قیصر و کسریٰ کی نسبت مسلمانوں کے عادلانہ اور سماجی مساوات پر مبنی اندازِ حکم رانی اور مناسب اور قانونی ٹیکسوں کے نفاذ کو خوش آمدید کہا اور یہی چیز ان کے قبولِ اسلام کا بنیادی سبب بنی۔

دوسرے، ہمیں اہلِ مغرب کو یہ احساس دلانا ہوگا کہ جنگ انسانی نفسیات کا لازمی جزو ہے۔ اس لیے دنیا کی ہر تہذیب میں جنگ بہ ہر طور موجود رہی ہے ۔ اہلِ مغرب، جو اس وقت امن کے سب سے بڑے داعی ہیں، ان کا موجودہ رویہ اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے ۔ اسلام نے انسانی نفسیات کے اس پہلو سے آنکھیں بند نہیں کیں ، بلکہ انسان کے جنگی جنون کی تہذیب و تطہیر کر کے اس کو جہاد کے روپ میں پیش کیا ہے۔

اسلامی دنیا میں مذہبی تکثیریت کا وجود

اہلِ مغرب میں اسلام کے بارے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اقلیتوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس لئے مغرب سے مکالمہ میں اس نکتہ کو اجاگر کرنا ضروری ہے کہ عہدِ رسالت ﷺ اور اس کے بعد کی اسلامی دنیا بالخصوص مصر، لبنان، ہندوستان اور عثمانی ترکوں کے دور میں ہمیشہ قرآنی اصول کے مطابق لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔ اسلامی دنیا میں مذہبی تکثیریت کا وجود ہمارے موقف کی واضح شہادت مہیا کرتا ہے ۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید کی اصولی تعلیم: لاَ إِكْـرَاهَ فِـيْ الدِّيْنِ (البقرۃ:۲۵۶) (دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے) کی نظری اور عملی تبلیغ اور اشاعت کی جائے ۔ اس کے علاوہ عہدِ رسالت ﷺ، عہدِ خلافتِ راشدہ اور مسلم عروج کے ان تاریخی معاہدات سے بھی استشہاد کیا جا سکتا ہے، جن میں مذہبی آزادی کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

خلافت اور جمہوریت

اسلام کے سلسلے میں مغرب میں ایک اور غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اگر مسلمان اقتدار میں آ گئے تو وہ پوری دنیا میں خلافت کا نظام نافذ کریں گے اور لوگوں کی شخصی آزادیاں اور حقوق سلب کر لیں گے۔ اسلامی نظامِ خلافت کے خلاف اہلِ مغرب کی اس غلط فہمی کی اصل وجہ اور پس منظر سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس غلط فہمی کی بڑی وجہ مغرب کا وہ دور ہے جسے قرونِ مظلمہ (Dark Ages) کہا جاتا ہے، جس میں پوپ ہی طاقت کا اصل سرچشمہ اور فائنل اتھارٹی (Final Authority) تھا۔ پوپ نے ہمیشہ اربابِ حل وعقد کا ساتھ دیا اور حکمرانوں کو مذہبی تحفظ فراہم کیا، دوسری طرف عوام کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہ تھے۔ اصل میں مغرب نے اسلام کے نظامِ خلافت کو بھی یورپ کے دورِ تاریک میں اپنے ہاں پائی جانے والی مذہبی حکومتوں پر قیاس کر رکھا ہے۔ مغرب نے صدیوں کی کشمکش کے بعد جو سیاسی اور شخصی آزادی حاصل کی ہے وہ اب اسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔

اب ہمارا فرض ہے کہ ہم مغرب پر یہ بات واضح کریں کہ اسلام کے تصورِ خلافت کو پاپائیت سے کوئی نسبت نہیں، کیوں کہ مسلمانوں کا خلیفہ عیسائیوں کے پوپ کی طرح خدا کا نمائندہ نہیں ہے، جس کی کسی بات کو نہ چیلنج کیا جا سکتا ہے اور نہ وہ کسی اصول کا پابند ہے۔ ایک دفعہ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ (م ۱۳ھ) کو ایک شخص نے 'یاخلیفۃَ اللّٰہِ' (اے اللہ کے خلیفہ) کہا تو آپؓ نے فوراً اس کی اصلاح کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اللہ کا خلیفہ نہیں، بلکہ اس کے رسول ﷺ کا خلیفہ ہوں۔[۱۳] پوپ کے برعکس مسلمانوں کا خلیفہ خدا کے بجائے رسول اللہ ﷺ کا نمائندہ ہے، جو مطلق العنان نہیں، بلکہ اصول کا پابند ہوتا ہے، جس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور جو ایک خاص دائرے میں رہ کر ہی اپنے فرائضِ منصبی ادا کر سکتا ہے، چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ خلفاء راشدین سے عام مسلمانوں نے نہ صرف اختلاف کیا، بلکہ بسا اوقات ان کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور

بھی کیا۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ (م ۲۳ھ) نے جب مسلمان عورتوں کے لئے مہر کی ایک خاص مقدار مقرر کرنا چاہی تو ایک خاتون نے ان کو برسرِ منبر ٹوک دیا اور حضرت عمرؓ کو اپنی رائے سے رجوع کرنا پڑا۔[۱۴]

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان علماء نے ہمیشہ دلیل اور حق کا ساتھ دیا ہے اور ہمیشہ عوام کے شانہ بہ شانہ مذہبی اور سیاسی حقوق کی جنگ لڑی ہے۔ پوری اسلامی تاریخ اس طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) امام احمد بن حنبلؒ (م ۲۴۱ھ) اور کتنے ہی جلیل القدر ائمہ نے وقت کے حکمرانوں کو چیلنج کیا اور اپنی جانوں تک کی پروا نہ کی۔ ہمیں مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ ہمارا ماضی ان کے ماضی سے بالکل مختلف ہے، اس لئے مغرب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا تاریک ماضی دکھا کر ہمیں ہمارے روشن ماضی سے محروم کردے۔

اگر ہم اہلِ مغرب کو اس بات پر قائل کرلیں کہ اسلام کا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام انسانی سوسائٹی کے لیے زیادہ مفید اور بہتر ہے تو پھر شاید ہمارے لئے ان کے ان تحفظات کو دور کرنا مشکل نہیں ہوگا جن کا تعلق دین اور مذہب کی اساس سے ہے۔ اہلِ مغرب کے وہ تحفظات جن کا تعلق اسلام کے بنیادی اور اساسی تصورات سے ہے وہ درج ذیل ہیں:

خدا کے وجود کا اثبات

یہاں بھی ہمیں اہلِ مغرب سے مکالمہ کرتے وقت اس ماحول کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا جس میں مغربی ذہن پروان چڑھتا اور شعور کی منازل طے کرتا ہے۔ اہل مغرب، جو ہر چیز کو عقل (Reason) کی بنیاد پر پرکھنے کے عادی ہیں، ان کے سامنے خدائی کتاب کی بنیاد پر اپنے دلائل شروع کرنے سے پہلے خود خدا کے وجود کو زیر بحث لانا ہوگا، ورنہ مغرب کی خطرناک حد تک آزاد سوچ ہمیں غیر سنجیدہ قرار دے گی۔ سائنسی امکان اور عقل کی بنیاد پر اگر خدا کے وجود کے لیے فطرت کے مشاہدے پر زور دیا جائے تو

شاید ہمیں کامیابی حاصل ہو، جیسا کہ مکی عہدِ نبوت میں رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مکہ کو عقل اور مشاہدۂ فطرت کی بنیاد پر اسلام کی طرف متوجہ کیا تھا۔

کیا اسلام عیسائیت اور یہودیت کی نئی صورت گری ہے؟

مغرب میں اسلام کے بارے میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص کے ذہن میں بھی یہ تصور راسخ ہے کہ اسلام کوئی مستقل دین نہیں، بلکہ عیسائیت اور یہودیت ہی کا نیا روپ ہے۔ اس خیال کی ترویج میں بنیادی کردار تحریکِ استشراق کا ہے۔ دوسری صدی ہجری کے مشہور عیسائی عالم یوحنا دمشقی (John of Damascus) کو تحریکِ استشراق کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے 'محاورۃ مع المسلم' اور 'ارشادات النصاریٰ فی جدل المسلمین' نامی کتب سے اسلام کے خلاف جس منفی پروپیگنڈے اور قلمی مناظرے کا آغاز کیا تھا، مغرب میں اس کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ نے اپنی قابل قدر تصنیف 'ضیاء النبی ﷺ' کی چھٹی اور ساتویں جلد میں تحریکِ استشراق کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اہلِ مغرب، جو سماجی، معاشرتی اور سائنسی علوم کی معراج کو پہنچے ہوئے ہیں، ان کے نزدیک آج بھی اسلام کے بارے میں نہ جاننا کم علمی کی دلیل نہیں ہے۔ مغرب میں یہ تاثر اب بھی عام ہے کہ اسلام عیسائیت اور یہودیت ہی کی مسخ شدہ تعلیمات پر مبنی ہے اور اسلامی قوانین یہودیوں کی فقہ 'تالمود' سے اخذ شدہ ہیں، جن کا زیادہ زور ان کے ظاہری الفاظ پر ہے نہ کہ مقاصد پر۔ جوزف شاخت (Josefh Schacht) نے اپنی کتاب The origins of Muhammadan Jurisprudence میں دعویٰ کیا ہے کہ اسلامی قانون رومن لا سے ماخوذ ہے۔ مشہور مستشرق ول ڈیورانٹ (Will Durant) (م ۱۹۸۱ء) نے اپنی کتاب The Age of Faith میں، فلپ کے ہٹی (Philip K. Hitti) نے اپنی کتاب Islam and the We st میں اور موریس سیل (Morris S. Seale) نے اپنی کتاب Muslim Theology میں دعویٰ کیا ہے کہ قرآن وحدیث کا بڑا حصہ یہودی اور عیسائی روایات

سے ماخوذ ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے تقابلی مطالعہ سے اہل مغرب کی اس غلط فہمی کو دور کیا جائے۔

قرآن وحی الٰہی ہے

رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے انکار کی وجہ سے مغرب میں قرآن کو آسمانی صحیفے کے بجائے محمد ﷺ کی ذاتی تصنیف سمجھا جاتا ہے۔اس غلط فہمی کی بڑی وجہ بھی ماضی کا پروپیگنڈا ہے جس کو زائل کرنے کی ضرورت ہے۔اگر چہ گذشتہ کئی صدیوں سے کئی یورپی زبانوں میں قرآن کا ترجمہ کیا جارہا ہے، لیکن ان تراجم کے اسلوب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان مترجمین کے پیش نظر اسلام کا تعارف کرانے کی نسبت مسیحی جنگ جوؤں کو مقدس جنگ (Sacred War) کے لیے مسلمانوں کے خلاف تیار کرنا تھا۔بعد کے دور میں قرآن مجید کے تراجم میں یہی اسلوب کسی نہ کسی انداز میں غالب رہا ہے۔اسی پروپیگنڈے کے زیر اثر مسلمانوں کو محمڈن (Muammadan) پکارا گیا اور اسی سے محمڈن لا (Muhammadan Law) کی اصطلاح وجود میں آئی۔

قرآن مجید ہر دور کے لیے نبی کریم ﷺ کا زندہ جاوید معجزہ ہے۔عہدِ رسالت میں بھی لوگوں نے قرآن مجید کو جب حضور ﷺ کی اختراع قرار دیا تو آپؐ نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت، اس کے اسلوبِ بیان اور ہر قسم کے تناقض سے مبرّا ہونے کو اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی دلیل کے طور پر پیش کیا۔عقل پرستی کے موجودہ دور میں قرآن مجید کا معجزانہ پہلو اس کی فطری تعلیمات کے علاوہ وہ سائنسی اور تاریخی حقائق ہیں جن کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآنِ مجید کے اس پہلو پر توجہ دیں اور اہلِ مغرب کو یہ بتائیں کہ کتنے ہی ایسے تاریخی اور سائنسی حقائق ہیں جن تک مغرب صدیوں کی محنت اور تجربات کے بعد پہنچا ہے، لیکن قرآنِ مجید نے صدیوں پہلے ان حقائق کو بیان کر دیا۔یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن کسی انسان کا نہیں، بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ڈاکٹر موریس بوکائے کی کتاب The Bible,The Quran and Science

اوراس کے بعد اس موضوع پر شائع ہونے والی دیگر کتب اس ذیل میں ہماری توجہ کی خصوصی مستحق ہیں۔

اہلِ مغرب میں اعلیٰ ترین سطح پر اب یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ مذہب سے مکمل دست برداری ان کے معاشرتی اور تہذیبی زوال کا باعث بن رہی ہے اور موجودہ مغربی فلسفہ ان کے تمام مسائل کا حل نہیں ہے۔ اس وقت اہلِ مغرب جو روحانی خلا محسوس کر رہے ہیں اس کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فی الوقت مغربی سیکولرزم کو ایک خاص مفہوم میں بحران کا سامنا ہے۔ آج کی عالمی صورتِ حال میں مذہب ایک بار پھر اہلِ مغرب کی زندگی میں دبے پاؤں داخل ہو رہا ہے۔۱۵ اس لیے مسلمان اہلِ علم کے لیے یہ مناسب وقت ہے کہ وہ اہلِ مغرب کے سامنے اسلام کو بہتر انداز میں پیش کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مغرب کی نفسیات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اسلام کو آج کے جدید اسلوب، تکنیک اور زبان میں پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اپنی فطری تعلیمات کی وجہ سے مغرب کے اعلیٰ ذہن کو متاثر نہ کرے۔

کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لئے رجالِ کار کی تیاری بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ چوں کہ اسلام کی اشاعت کا تمام انحصار دعوت وتبلیغ اور دوسری قوموں سے مکالمے پر ہے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف بین المذاہب مکالمے کی عملی مثال قائم کی، بلکہ ایسے افراد بھی تیار کیے جو دوسری قوموں سے مکالمے کی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ لیکن ہمارا المیہ یہ ہے کہ اب جب کہ حالات کے جبر نے ہمیں بین المذاہب مکالمے کی میز پر بیٹھنے پر مجبور کر دیا ہے، ہمارے پاس ایسے افراد کی شدید کمی ہے جو مغربی فکر وفلسفہ پر گہری تنقیدی نظر رکھتے ہوں اور جو اہلِ مغرب کی ذہنی ساخت، ان کی نفسیات، پسِ منظر اور تکنیک سے واقف ہوں۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ہاں جو لوگ علمی رسوخ رکھتے ہیں وہ مغربی زبان وادب اور مغرب کی نفسیات سے واقف نہیں اور جو لوگ مغربی زبان اور محاورے کو جانتے ہیں وہ علمی طور پر کم زور ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دینی مدارس اور جامعات کے نصابِ تعلیم میں مغربی

فکر وفلسفہ کو بہ طور لازمی مضمون کے شاملِ نصاب کیا جائے ،تاکہ ایسے رجالِ کار کی تیاری ممکن ہو جو مغرب کے دانش ور طبقے سے پورے اعتماد کے ساتھ بات کرسکیں ۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یونانی فکر وفلسفہ کے عروج کے دور میں مسلمان اہلِ علم نے یونانی علم کلام اور فلسفہ پر مکمل عبور حاصل کیا تھا اور پھر یونانی فکر وفلسفہ کے علمی اور تحلیلی جائزے کے بعد اسلامی فکر کی برتری کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا تھا۔ دورِ حاضر میں مسلمان اہل علم پر لازم ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی تاریخ کو دہراتے ہوئے جدید علم کلام اور مغربی فکر وفلسفہ پر عبور حاصل کریں ،تاکہ مغربی فکر کا بھرپور تنقیدی جائزہ لے کر اس کی کم زوریوں اور کھوکھلے پن کو واضح کیا جاسکے۔

ایک اور چیز جس کا ہمیں خاص طور سے لحاظ رکھنا چاہیے وہ یہ کہ مغرب کے ساتھ مکالمہ میں ہمارا رویہ معذرت خواہانہ اور دفاعی کے بجائے اقدامی ہونا چاہیے۔ہمیں اسلام کے بنیادی عقائد اور نظریات کی ایسی تاویل سے اجتناب کرنا چاہیے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو۔معروف روایت کے مطابق جب قریشی وفد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ کے سامنے مختلف متبادل (Options) رکھے کہ آپؐ جو پیش کش بھی چاہیں قبول کرلیں، مگر دعوت وتبلیغ سے باز آجائیں تو آپؐ نے اس وقت جو الفاظ ارشاد فرمائے تھے وہ ذہنی مرعوبیت کے شکار لوگوں کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔آپؐ نے فرمایا تھا: ''اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تب بھی میں اپنے مشن سے پیچھے ہٹنے والا نہیں''۔۱۶ اسی طرح جب شاہِ حبشہ نجاشی نے مسلمانوں کو دربار میں طلب کیا، تاکہ وہ حضرت عیسیٰؑ اور عیسائی مذہب کے بارے میں اپنا موقف بیان کریں ،تو مسلمانوں سخت پریشان ہوئے ، کیوں کہ سچ کہنے کی صورت میں نجاشی اور درباریوں کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا ،لیکن آپ ﷺ کے تربیت یافتہ صحابہ کرامؓ نے باہمی مشاورت کے بعد یہ متفقہ فیصلہ کیا:

نقول و اللّٰہ ماقال اللّٰہ و ماجاء نابہ نبینا. ۱۷	اللہ کی قسم، ہم وہی کہیں گے جو اللہ نے فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے جس کی تعلیم دی ہے۔

اس لیے ہمیں کسی قسم کی ذہنی مرعوبیت کے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ مغرب کو قائل کرنا ہوگا کہ اسلام ہی ایک ایسا تریاق ہے جو مغرب کی تہذیب کو ہر قسم کے نقائص سے پاک کر کے زندہ جاوید کر سکتا ہے۔ مغرب کے تمام مسائل، خاندانی نظام کی شیرازہ بندی، بچوں میں بڑوں کا احترام پیدا کرنا، باہمی اخوت، نسلی تفاخر کا خاتمہ، نفسیاتی استحکام، احترامِ آدمیت، تحمل، ایڈز جیسی بیماریوں کے خلاف سماجی مدافعت وغیرہ کا حل صرف اسلام کے پاس ہے۔

حواشی ومراجع

۱ سید سلیمان ندوی، سیرۃ النبی ﷺ، الفیصل ناشران وتاجران کتب، اردو بازار، لاہور، ۹۱/۴

۲ مسند احمد، حدیث زید بن ثابتؓ، ۱۱۰۸، ۶/ ۲۳۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۱ء

۳ سنن ابی داود، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، ۲۲۷۷

۴ سرخسی، المبسوط، کتاب الصلوٰۃ، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۷۸ء، ۳۷/۱

۵ ڈاکٹر حمید اللہ، صحیفہ ہمام بن منبہ، ناشر رشید اللہ یعقوب، کلفٹن، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۳

۶ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۵ء، ۳۵۱/۳

یہاں ضمناً ایک اور بات کا ذہن نشین رہنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں اسلام کی امن پسندی پر استدلال کے لئے صلح حدیبیہ کا حوالہ جس انداز سے دیا جاتا ہے اس سے اس عظیم تاریخی واقعے کی حیثیت محض ایک منفی سمجھوتے کی سی ہو کر رہ جاتی ہے، حالاں کہ کوئی بھی تاریخی واقعہ یک دم وقوع پذیر نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ کو بھی اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۶ ھ سے قبل کے واقعات اسلام کے متعلق ہر قسم کے مفعولی تاثر کو ختم کر چکے تھے۔ اس پس منظر میں صلح کا معاہدہ مسلمانوں سے زیادہ خود قریش کی ضرورت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لئے مسلمانوں سے مشہور بیعت 'بیعتِ رضوان' لی اور مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو گئے تو قریش نے عافیت اسی میں جانی کہ صلح کے موقع کو ضائع نہ کیا جائے۔ تاہم آپؐ نے جن شرائط پر صلح کی اس سے آپؐ کی امن پسندی کا واضح

ثبوت ملتا ہے۔

۷۔ ابنِ الاثیر الجزری، اسد الغابۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۳۶۲/۱

۸۔ ابن قیم الجوزیہ، زاد المعاد، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، ۱۹۷۹ء، ۶۹۱/۳، ۶۹۲

۹۔ اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ ہو: صحابہ کرام کا اسلوبِ دعوت وتبلیغ، ناشر، مکتبہ جمال کرم، لاہور، ۲۰۰۴ء، صفحہ ۱۷۷۔ ۱۸۷

۱۰۔ مسند احمد، ۶۵۴/۱، ح: ۳۷۵۲، حدیث عبداللہ بن مسعود

۱۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبری، ۲۳۲/۱، ذکر نقش خاتم رسول اللہ ﷺ

۱۲۔ ڈاکٹر حمید اللہؒ، رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، دارالاشاعت، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۷

۱۳۔ ابو یعلیٰ، الاحکام السّلطانیۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۸۳ء، ص: ۲۷

۱۴۔ ابن العربیؒ، احکام القرآن، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ۴۶۹/۱، تفسیر آیت: وَ آتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَاراً (النساء: ۲۰)

۱۵۔ اس حوالے سے پروفیسر میاں انعام الرحمٰن کا تجزیاتی مضمون جو ماہنامہ 'الشریعۃ' گوجرانوالہ، اگست ۲۰۰۵ء میں ''مغرب کی ابھرتی ہوئی مذہبی شناخت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، قابل مطالعہ ہے۔

۱۶۔ ابن کثیرؒ، البدایۃ والنہایۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۱ء، ۶۶/۳

۱۷۔ سیرت ابنِ ہشام، ۳۷۳/۱

☆☆☆

پاکستان میں

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی کے لیے رابطہ کریں:

جناب سجاد الٰہی صاحب، 27-A، لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور

Tel: 0300-4682752, (R)5863609, (0)7280916

Email: Sammaradnan<talluadnan@yahoo.com>